انور خاں کی کہانی "راستے اور کھڑکیاں" کا موضوعاتی مطالعہ

ڈاکٹر وصی احمد شمشاد
گیسٹ فیکلٹی، شعبہ اردو، ایل، این، ایم، یو، دربھنگہ

ملخص

ترقی پسند ادب کی ہوا جب مدہم پڑ گئی تو ادب میں نئے رجحان نے قدم رکھا جسے جدیدیت کا نام دیا جاتا ہے اس رجحان کے زیر اثر جدید افسانے رقم کیے جانے لگے جس سے اردو افسانہ نگاری میں بھونچال سا برپا ہو گیا اور اس کے زیر اثر علامتی، استعاراتی، تجریدی اور دیومالائی افسانے ترتیب دیئے جانے لگے اور اس سے قبل تک جو لوگ ترقی پسند تحریک کے اصولوں سے بندھے ہوئے تھے وہ بھی اس سے رفتہ رفتہ متاثر ہونے لگے اور کثیر افسانہ نگاروں میں ترقی پسندی کے جمود کو توڑتے ہوئے جدید افسانے لکھنے میں منہمک ہو گئے۔ جب جدیدیت کی ہوا مدھم پڑنے لگی تو معا بعد جدیدت کے زیر اثر افسانہ لکھے جانے لگے۔ اسی کڑی کے اہم افسانہ نگار انور خاں ہیں جن کے افسانوں میں موضوعات کی جدت نظر آتی ہے۔

1980ء کے بعد جو افسانہ نگار افسانہ نگاری کے میدان میں اپنا قدم جماتے ہیں ان میں ایک نام انور خاں کا بھی ہے۔ انہوں نے نوآبادیاتی نظام کی تمام تر سفاکیوں کو اپنے افسانے کا موضوع بنایا ہے اور اسی کے ساتھ ساتھ شہر کاری اور عالم کاری کے وجود میں آنے کے باعث جو تہذیب و ثقافت جنم لیتی ہے ان تمام پہلوؤں کو بھی انور خاں نے اپنے افسانے میں جگہ دی ہے۔ انور خاں بھی ہم عصر افسانہ نگاروں کی طرح جزئیات نگاری کی تکنیک سے مستفید ہوتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ ان کے ہاں زبان کی خامیاں دیکھنے کو نہیں ملتیں۔ تنہائی انسانی زندگی میں

بہت عام چیز ہے اور تنہائی پن کا احساس عمر کے کسی بھی حصے میں پیدا ہوسکتا ہے۔ یہ تنہائی نوجوانی میں اگر ہو تو نوجوانوں کو فن کار بنا دیتی ہے اور اگر یہی تنہائی اگر بڑھاپے میں ہو تو بنی نوع انسان کو گھٹ گھٹ کر جینے پر مجبور کر دیتی ہے۔

انور خاں کی کہانی "راستے اور کھڑکیاں" اور افسانے سے قدرے مختلف ہے۔ کہانی یوں ہے کہ نوجوانی میں مسعود نامی ایک شخص تنہائی کے دلدل میں پھنس جاتا ہے جب کہ وہیں بڑھاپے میں قدم رکھنے والے شرما جی اور مسٹر رتنا کر خود کو اس احساس سے آزاد کر لیتے ہیں۔ مسعود کو بغرض ملازمت کہیں دور شہر میں جا کر رہنا پڑتا ہے۔ آفس کے کسی دوست کی مدد سے اسے ایک ایسا کمرہ مل جاتا ہے جس میں ایڈوانس کچھ بھی نہیں دینا پڑتا مگر کمرے کا مالک شرما جی ضعیف العمر ہے اور اس کا اس دنیا میں سوائے ایک بھائی کے اور کوئی نہیں اور وہ بھی کہیں اور رہتا ہے۔ ایسے میں تنہائی کے علاوہ شرما جی کے پاس سوائے موت کے اور کچھ نظر نہیں آتا جب شرما جی مسعود سے ملے تو امید کی کرن نظر آئی مگر مسعود نے بھی ان کے ساتھ اچھا برتاو نہ کیا۔ ان کردار کے علاوہ ایک کردار رتنا کر بھی ہے جو پنشن پر اپنی زندگی گزارتا ہے وہ بھی بڑھاپے کا سہارا ڈھونڈتے ہوئے شرما جی کے پاس آجاتا ہے۔ اب جب دونوں ضعیف مل گئے تو کوئی تنہا نہ بچا لیکن وہ نوجوان مسعود جو کہ شرما جی کی باتوں سے تنگ آ چکا تھا اب دونوں بوڑھوں کو مشغول پا کر خود تنہائی کے دلدل میں پھنس گیا۔ شرما جی کی زیادہ تر باتیں شفقت آمیز ہوتی تھیں یہی چیز مسعود کو چبھتی تھی۔

اقتباس:

"ان کا بار بار مداخلت کرنا مجھے کھلنے لگا یہ قمیص ان
پتلون کے ساتھ نہیں پہننی چاہیے۔ تمھارے
جوتوں پر پالش کیوں نہیں ہے۔ تمھیں رات میں
جلدی گھر لوٹنا چاہیے۔ اس طرح کے جملے سن سن
کر میں بیزار ہو گیا۔ پہلی بار گھر والوں سے دور

رہنے کا موقع ملا تھا۔اس بات کی خوشی تھی کہ یہاں
بات بات پر کوئی ٹوکنے والا نہیں ہے کہ شرما جی
میرے سرپرست بن بیٹھے۔"

متوسط طبقے کے مہذب گھرانے کے نوجوانوں کو بات بات پر ٹوکنا اور نصیحت برداشت کرنا پڑے تو اس سے آزاد رہنے کو جی چاہتا ہے جو کہ عام نفسیات میں شامل ہے مگر انسانیت کے ناطے چند ذمہ داریاں نبھانا اہم فریضہ ہوتا ہے۔اگر مسعود میاں نے کم از کم شرما جی کی تنہائی اور ضعیف العمری کا خیال رکھا ہوتا تو یہ نوبت کبھی نہ آتی کیوں کہ شرما جی کو تنہائی دور کرنے کے لیے کسی کی ضرورت پڑتی اور نہ ہی مسٹر رتنا کر آتے۔مسٹر رتنا کر سے قبل شرما جی اپنے دل کی بات کچھ اس طرح سے بیان کرتے ہوئے نظر آتے ہیں کہ یہ تنہائی کا درد صرف ان کی نہ ہو کر ان تمام ضعیف العمر کے دلوں کی داستان لگتی ہے۔افسانہ کا اقتباس دیکھیں:

''مسعود صاحب میری طبیعت تو ٹھیک ہے نا؟''
میں خاموش رہا۔
''میں زندگی سے تنگ آ گیا ہوں۔'' انھوں نے بات آگے
بڑھائی۔'' میرے بھائی کو دیکھو اُسے میری ذرا بھی فکر نہیں
ہے۔میں چاہے مروں یا جیوں۔ایک سو پچاس روپئے کیا
دیتا ہے گویا احسان کر دیا۔کوئی میرا خیال رکھنے والا
نہیں۔تمہارا کیا خیال ہے' میری طبیعت تو ٹھیک ہے نا''

انسانی نفسیات کا ایک حصہ انا پرستی بھی ہے جو کہ خود پسندی پر مبنی ہوتا ہے جس میں انسان اپنے ضمیر اور شخصیت کی عزت بذات خود کرتا ہے۔شرما جی کو جب یہ احساس ہوا کہ مسعود

میاں ان کی باتوں کا جواب دینے کے بجائے ان کے تئیں نفرت کا جذبہ رکھتے ہیں تو ان کی انا کو ٹھیس لگتی ہے اور مسٹر رتنا کر کا بھی اس عمر میں الگ رہنا کسی کی انا کو بھی اُکساتا ہے ورنہ نوکری سے سبکدوشی کے بعد لوگ اپنوں کے بیچ رہنا زیادہ پسند کرتے ہیں۔

''مسعود صاحب! میں سمجھتا ہوں کہ میری باتوں سے آپ
بور ہوتے ہیں۔لیکن کیا کروں اکیلا آدمی ہوں۔جی گھبراتا
ہے اس لیے کچھ نہ کچھ بکواس کرتا رہتا ہوں''

انور خاں نے اس افسانے میں جن سوالات کی نشان دہی کی ہے ان کا تعلق آج کے ما بعد جدید دور سے ہے جس میں ہر انسان خود کو تنہا پا رہا ہے۔شہری زندگی نے اس تنہائی کو اور بھی زیادہ سفاک بنا دیا ہے۔شہروں کی دوڑتی بھاگتی زندگی نے لوگوں کو اس قدر مصروف بنا دیا ہے کہ ایک دوسرے سے بات کر کے من کو ہلکا کرنے کی بھی فرصت نہ رہی۔

افسانہ عام فہم اور بیانیہ انداز میں ترتیب دیا گیا ہے،ایک راوی اپنا قصہ بیان کر رہا ہے۔زبان دلکش،صاف،سلیس اور رواں ہے اور اس کے اندر قصہ گوئی کے تمام عناصر موجود ہیں۔